محمد حنیف ندوی

تاثرات

مصر پر اسرائیل۔ انگریز اور فرانس نے جو یکایک حملہ کیا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سویز کو قومی تحویل میں لے لینے کے بعد انگریزوں کی سیاسی پوزیشن خاصی کمزور ہو چکی تھی اور یہی نہیں مصر کے اس اقدام سے اس کے پندارِ استعمار کو سخت ٹھیس لگی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ مصر نے یقین دلایا تھا کہ سویز میں جہازرانی کے دروازے سب قوموں کے لئے کھلے رہیں گے۔ پھر کسی مرحلہ پر بھی گفتگو اور باہمی بات چیت میں رکاوٹ پیدا نہیں کی گئی تھی ہوا صرف یہ تھا کہ مصر اس موقف کو ماننے پر آمادہ نہیں تھا جس کو اقوامِ غالب نے اپنے مفادات کے پیشِ نظر تجویز کیا تھا۔ بلکہ اب یہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکا تھا کہ سویز پر مصریوں کی بالادستی قائم رہنا چاہئے اور اس کے نظم ونسق اور مالیات کے سلسلہ میں مصر کے اس تفوق کا اعتراف کرنا چاہئے جو اسے قدرتاً حاصل ہے اور کوئی منطق جس کو جھٹلا دینے پر قادر نہیں۔ یہی وہ صورت حال تھی جو انگریز کو منظور نہیں تھی۔ رہی یہ بات کہ اس سے استعمار کی وسعتیں سمٹتی تھیں۔ تو اس کا علاج مصر کے پاس کیا تھا۔

مصر کے اس اقدام کا جواب برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایڈن نے یوں دیا کہ اسرائیل کو شتکارا، فرانس کو گانٹھا اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مصر پر ہلہ بول دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح قوت وطاقت کے مظاہروں سے ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ جس سے سویز کے مسئلہ میں من مانی شرائط پر سمجھوتہ کرنے میں مدد مل سکے۔

لیکن کیا وہ اس طرح اپنے منصوبے میں کامیاب رہے؟ اور کیا انہیں ان خطروں کا احساس ہے لواُن دوررس سیاسی نتائج کا علم ہے جو مشرق اوسط میں اُبھر رہے ہیں۔ اور کیا انہیں معلوم ہے کہ ان کے اس اقدام نے ان کے خلاف ساری دنیائے اسلام میں کس درجہ نفرت وحقارت کی آگ بھڑکا دی ہے۔ اور ان کو اس ناروا حرکت کی کتنی گراں قیمت ادا کرنا پڑیگی؟ یہ سوالات ایسے ہیں جن کا تعلق حملہ آور قوموں کے فکر وتدبّر سے ہے اور اس سے ہے کہ مستقبل قریب میں امریکہ، روس اور اسلامی ممالک کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ہم اس پر حاشیہ آرائی کرنا نہیں چاہتے اس لئے کہ یہ مسائل ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ اس گھناؤنے فعل نے کچھ خوشگوار اور عمدہ پہلوؤں کو بھی جنم دیا ہے۔ جو نہایت مبارک ہیں۔

مثلاً مصری عوام نے جس استقلال، جانفشانی اور شجاعت سے حریف کے واروں کو روکا ہے۔ اور بچوں بوڑھوں اور نوجوانوں نے جس بسالت سے لڑائی کی ہولناکیوں کا مقابلہ کیا ہے اور پاکستان کے عوام اور پاکستان کے اہلِ سیاست نے ہر سطح سے جس اخلاص، جوش اور جرأت سے ان کا ساتھ دیا ہے اور اپنی ہمدردیوں کا یقین دلایا ہے اس سے سارے ایشیا کا وقار بڑھ گیا ہے اور مسلمانوں کے جذبۂ افتخار میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس سے دشمنوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ مسلمان ناقابلِ تسخیر قوم ہیں۔ اس سے تاریخ کے ایک اہم باب کا آغاز ہوا ہے۔

اس سے قبل حفاظتی کونسل کے متعلق بجا طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اقوامِ قاہرہ کی استعماری بے ہودگیوں کو جائز قرار دینے والا ایک ادارہ ہے۔ مگر ان حملوں کو روکنے، مؤثر قدم اٹھانے اور بروقت اور منصفانہ طرزِ عمل اختیار کرنے میں ابکی مرتبہ ہیمر شولڈ نے جو نمونہ پیش کیا ہے وہ بلاشبہ قابلِ تعریف ہے۔ اور اس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ قوموں کا اجتماعی ضمیر ابھی زندہ ہے اور اگر عالمی نوعیت کے تمام جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے اسی جرأت اور عجلت سے کام لیا جائے تو اس ادارہ کو اس سے زیادہ کامیابی سے چلایا جا سکتا ہے۔ اور تنہا مصر ہی میں نہیں بلکہ ہنگری اور کشمیر میں بھی جارحیت کا سدِباب کیا جا سکتا ہے۔

انگلستان کی موجودہ حکومت کی جس قدر مذمت چاہیئے کیجئے، لیکن انگریزوں کی قوم نے اس اقدام کے خلاف جو مظاہرے کئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ حکومتیں ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہیں۔ اصل چیز قوموں کا مزاج اور ضمیر ہے۔ اگر انگریزوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی موجود ہے کہ جو جمہوریت و امن پر ایمان و اثق رکھتی ہے اور اپنی ہی حکومت کے غلط اور ظالمانہ منصوبوں پر پُرزور احتجاج کر سکتی ہے تو اس کے لئے یہ حقیقتاً تحسین کے لائق ہے۔

اسی جنگ کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ پہلی دفعہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی برطانیہ سے الگ ہونا چاہیئے۔ اور ہمیں اس کے استعماری مقاصد کے لئے آلہ کار نہیں بننا چاہیئے۔ یہ نہایت خوش آیند ہے۔ اس بنیاد پر اس نے اگر عرب ممالک کی مدد کی اور عربوں کے دلوں کو مٹھی میں لینے کی کوشش کی تو اس سے بہت سی تلخیاں دور ہو جائیں گی۔

ٹرکی نے جو اسرائیل سے قدرے تعلق منقطع کیا ہے۔ اس کو بھی اسی ضمن میں رکھئے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ عربوں اور ترکوں میں جو پرانے اختلافات ہیں ان کو ختم ہونا چاہیئے۔ اور اسلامی ممالک کو ایک دوسرے کے قریب آنا چاہیئے۔

ناانصافی ہوگی اگر ہم ان فوائد کے پہلو بہ پہلو اس پیچیدگی کا ذکر نہ کریں جو اسلامی ممالک کی خارجہ پالیسی سے متعلق بساطِ سیاست پر اُبھر آئی ہے اور مصر و اسرائیل کی اس جنگ نے اس کو اور اُجاگر کر دیا ہے۔ نظری اعتبار سے تمام مسلمان ملکوں کو ایک صف میں ہونا چاہیئے تھا۔ اور ایک بلاک کی صورت میں ارتقاء و تقدم کی منزلوں کو طے کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ان میں اچھی خاصی تفریق پائی جاتی ہے۔ اور تفریق بھی ایسی کہ جو حقیقی اور لائقِ اعتنا مجبوریوں پر مبنی ہے۔ ترکی کے جغرافیائی اور سیاسی حالات ایسے ہیں کہ اس کو بہر آئینہ برطانیہ کے ساتھ اپنے رشتوں کو استوار رکھنا پڑ رہا ہے۔ عراق اور شام کے اختلافات اس نازک دور میں بھی ختم نہیں ہو پائے۔ اس لئے قدرتاً ان کی خارجہ پالیسی بھی ایک نہیں ہو سکتی۔ ایران کے ڈانڈے روس سے ملے ہوئے ہیں اور اگرچہ علوم و فنون کی دوڑ میں یہ آجکل پسماندہ ہے تاہم ہمیشہ سے ایک طرح کی تہذیبی انفرادیت رکھتا ہے اس لئے طبعاً نہیں چاہتا کہ روسی اثرات کی دخل اندازیوں کی حوصلہ افزائی کرے اور اپنے خیالات و افکار سے دست بردار ہو جائے۔ روس کے ساتھ تعلقات بڑھانے میں ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ اس طرح برسرِ اقتدار گروہ ملوکیت کی قابلِ اعتماد پناہ گاہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ مصر کی جنگ چونکہ براہِ راست برطانیہ اور فرانس کے استعماری عزائم سے ہے اس لئے وہ ان کی دوستی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ وہ بالکل آزاد ہے جن قوتوں سے چاہے مدد لے اور جن حکومتوں سے چاہے اپنا سیاسی ناطہ جوڑے کسی دوسرے ملک کو اس پر اعتراض کا حق حاصل نہیں۔ سعودی عرب اگرچہ امریکہ سے وابستہ ہے مگر برطانیہ سے بھی قطع تعلق نہیں چاہتا کیونکہ اسکے سیاسی اور اقتصادی ڈھانچہ کی استواریوں کا یہی تقاضا ہے۔ اسی لئے وہ ایک حد تک مصر کا ہم نوا ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارہ میں کچھ کہنے سے پہلے اس واقعہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کا تعلق مصر کی موجودہ افراتفری سے ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہت پہلے اس کو اپنے حالات اور تقاضوں کے مطابق سوچ سمجھ کر مرتب کیا گیا تھا۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ ان افسوسناک حالات کے باوجود جو اس جنگ میں پیش آئے ہیں، اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں ضرورت نہیں؟ اس میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جن خطرات اور حقائق کے پیشِ نظر اس کو مرتب کیا گیا تھا، وہ ابھی جوں کے توں موجود ہیں۔ اس ضمن میں ان نکات پر خصوصیت سے توجہ مبذول رہنا چاہیئے کہ پاکستان اپنے ذرائع اور وسائل کے اعتبار سے ایک ایسا ملک ہے جو کسی صورت میں بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اس کو اپنی عمرانی اور تہذیبی ترقی کی خاطر حلیف ملکوں اور قوموں کی طرف لامحالہ دوستی کا ہاتھ بڑھانا ہے۔ یہ دوستی سیاسی اعتبار سے بھی ضروری ہے کیونکہ پاکستان ایک شدید دشمنی اور مخاصمت کا رہینِ منت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس کی تخلیق میں جس بنیادی عنصر نے کام کیا وہ ہندو کی فطری تنگ نظری ہے جو ہزاروں سال سے اس کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے اور لطف یہ ہے کہ ابھی تک اس کے ذہن و فکر سے اس کی تلخیاں دور نہیں

ہوئیں۔ حیدرآباد کو یہ بُری طرح ختم کر چکا ہے۔ جوناگڑھ اور بھوپال پر قابض ہے اور کشمیر میں اُسی جارحیت، اُسی ناانصافی اور ہٹ دھرمی پر قائم ہے جو تنگ نظر قوموں کا شیوہ ہے۔

ان حالات میں مصر اور شام کے لیڈروں کو معلوم ہونا چاہئے کہ پاکستان کے لئے ہندوستان ایک حقیقی خطرہ ہے اور مسئلہ کشمیر کی نزاکت اسرائیلی نزاکت سے قطعی مختلف نہیں۔ یہاں بھی کسی وقت جنگ کی آگ بھڑک سکتی ہے اور وہی خطرناک صورتِ حالات پیدا ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے عرب ممالک پریشان ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدانخواستہ اگر یہاں جنگ کا آتش فشاں پھٹ پڑا تو عرب ممالک اس مشکل سے نمٹنے کے لئے ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ روس کی طرف اسکی قوت و اثر کا لوہا ماننے کے باوجود اس لئے اُمید و رجا کے جذبات لئے ہوئے نہیں بڑھ سکتے کہ اس کے عمرانی اور تہذیبی نظریوں سے متفق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان خالص دینی مملکت ہے جس کا مطمح نظر اسلامی اندازِ حیات کو اپنانا اور اس کی دعوت کو پھیلانا ہے۔ اور روس لادینی ہی نہیں غیر دینی نظر و فکر کا علمبردار بھی ہے نظریات و افکار کے اس بعد المشرقین کو پاٹنا بھی آسان تھا اگر اس کے ہاں جمہوری اقدار کی کچھ بھی حوصلہ افزائی ہوتی اور کم از کم ایسا ہو پاتا کہ اشتراکی ریاستوں کی حد تک اس کا طرزِ عمل منصفانہ ہوتا اور سمجھا جاتا کہ اس سے ملنے کے معنی اپنی انفرادیت کو کھونا نہیں بلکہ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنا ہے۔ ہنگری میں جو تماشہ ہوا ہے اس کے بعد کون اس بلاک کے ساتھ وابستگی کو جائز قرار دے سکتا ہے۔ حالات کے اس رُخ کے سامنے آجانے کے بعد لے دے کر صرف برطانیہ کے ساتھ ہی روابط قائم رکھے جا سکتے ہیں جو اگرچہ جفاگر ہے، ظالم ہے، بہانہ جو ہے، مگر بڑی حد تک جمہوریت کا حامی ہے اسلئے پاکستان اپنی پالیسی پر عمل پیرا رہنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔

بظاہر اس حکمت عملی میں ایک کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے کہ ہمارے تعلقات ایک ایسے ملک سے استوار ہوں جو عرب ممالک میں حریف و دشمن کی حیثیت سے بدنام ہے۔ ہم اس تناقض کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ یہ تناقض ہم نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ یہ نتیجہ ہے ناگزیر عالمی حالات کی تبدیلیوں کا اور اسلامی ممالک کے اختلاف مقاصد کا۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ حتی الامکان اس تناقض کو کم کریں۔ اور اپنی پالیسی کو اس انداز سے پروان چڑھائیں کہ آخر آخر میں اس سے پاکستان بھی مضبوط اور استوار ہو اور عرب ممالک کی مشکلات بھی دور ہوں۔ اور ہم یہی کر رہے ہیں۔